سید کامران عباس کا%
لیکچرار، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام* د

معاصر اردو* ول اور عصری$

Twenty first century novel depicts the vicissitudes of its spirit. It also reflects the issues confronting the era. Most of the novels published during the last decade and a half are generally free from any ideological bias. These novels portray the core ethnic issues in Pakistani society. In this paper, the writer has analyzed the element of "spirit of the age" in these novels. An effort has also been made to probe into contemporary society through the spectrum of these novels.

کسی بھی عہد کا ادب اپنے* ر [شعور کی روشنی میں پ کھا جا* ہے اور اپنے عصر کے سماجی اور عمرانی پس منظر میں جا™ جاسکتا ہے۔ عصری$ مزاج تنقیدی نقطہÃ* ول کو اس کے* ر [، سماجی اور تہذR شعور کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ عصری$ مزاج تنقید کے ذریعے ہی* ول کے موضوعات اور اس کے نقطہÃ کو در - تناظر میں دیکھنا ممکن ہوسکتا ہے۔ ادب کا اپنے عہد کا عکاس ہو* اس کاC دی لازمہ ہے۔ ادب اپنے* ر [تسلسل میں ہی ارتقا کی منازل طے کر* ہے۔ سیاسی اور معاشیÂ م میں آنے والے تغیرات سے ادب کے موضوعات اور زاویہÃ میں+ ل جاتے ہیں اور یہی خصوصیت* ول کی بھی ہوتی ہے۔ اپنے عہد کی علمیات اور رجحا* ت * ول کا حصہ W ہیں*۔ ول کے موضوعات اور اس کی وسعت پ اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> * ول ا- طویل ی ادب ہے جس میں کردار اپنے تمام- حقائق اور تنوعات کے ساتھ جلوہ/ ہوتے ہیں۔ افسانے کی نسبت اس میں بہت ز* دہ پھیلاؤ ہو* ہے، ا- اعلیٰ فن کار اسے کئی ابعادی (Dimensional) بنا دینے پ قادر ہو* ہے۔ اس میں صداقت حقیقی K نی تجز* ت سے پھوٹتی ہے۔ اس کو حیات وممات کے مسائل سے سروکار ہو* ہے یوں* ول کی اصل اہمیت اس کی فلسفیانہ گہرائی ہے جو* د قارM کو اپنی/ فت میں رb ہے۔[1]

کوئی بھی سماجیÂ م . #* ر [اعتبار سے متروک ہو جا* ہے* نئی* ر [وعصری صورتحال میں اس کی اہمیت وضرورت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں ارتقا* تبد ~ کی گنجائش* پید ہو جاتی ہے تو اس کا بحران معاشرے کی رگوں اور شر* نوں میں ا- شورش اور خلفشار پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے معاشروں کی ز+ گی کا ہر پہلو، ہر شعبہ گلنے سڑنے لگتا ہے لیکن حکمران طبقات اسÂ م کو مسلط ر p کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اکثر اوقات وہ کامیاب رہتے ہیں لیکن اس صورت میں کہ وہ ڈ* ؤ پیدا کرنے والے عناصر کا محفوظ ا اج کر دیتے ہیں گو* کسی حد- تبد ~ . دا - کرلی جاتی ہے لیکن مکمل تبد ~* پ کستان سے مماثل سماج میں قبول نہیں کی جاتی۔ د* بھر میں اکیسویں صدی کو تبد ~ ، سائنسی انکشافات، بہتر K نی مستقبل، جمہوری$ اور K نی آزادیوں کے تصور کے ساتھ خوش آمد± کہاH لیکن* پ کستانی سماج ا- * ر پھر فوجی استبداد کاK نہ بن چکا تھا۔ تخلیقی فنکاروں کا سماجی شعور* لعموم اس امر سے آگاہ ہو چکا ہے کہ* پ کستانی ز* ستی اختیار و اقتدار میں جمہوری ادوار ہوں* فوجی، کوئی ڈی اورu یں تبد ~ پیدا نہیں ہوتی کیوè جمہوری$ فوج کی اجازت کے ساتھ* پ ؤںK رتی ہے اور . # فوجی اقتدار ملک کے سیاہ سفید کا. اہ را - مختار بن جا* ہے تو سیا - دان

اس بوسیدہ Âم کو کندھا دینے حاضر ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم* ت* پکستانی تخلیق کاروں نے شدت سے محسوس کی ہے کہ حکومتی ایوانوں میں آمدورفت د* کی ,ڑی طاقت کی مرضی و منشا کے مطابق ہوتی ہے، عوام محض تماشائی ہیں اور تماشا بھی۔ اکیسویں صدی کے* ول کا ا ـ موضوع تو امریکی* لادستی اور اس کے سائے میں سرمایہ دارانہ Âم کا پھیلاؤ ہے۔ دوسرا اہم موضوع* پکستان جیسے ملکوں کو پیداواری ملک W سے روک کر یہاں صارفیت کے کلچر کا فروغ ہے* کہ تیسری د* کے عوام مستقل سامراج کی منڈ* یں بنی رہیں۔ تشدد، خوف اور C دہ ستی بھی* پکستانی سماج کا اہم مسئلہ ہے اور ان مسائل کی پیداوار دراصل اس سماجی و سیاسی شعور کی کمی ہے جو ہمارے Âم تعلیم کی پیداوار ہے۔ ملک کا Âم تعلیم آج بھی طبقات میں منقسم ہے اور آقا و غلام کی تفریق پہ استوار ہے۔ قیام *پکستان کو ساٹھ سال سے زا# کا عرصہ گذر جانے کے* وجود اب بھی ا ـ ایسا Âم تعلیم وضع نہیں ہو** جو مساوات پہ F ہو۔ عوام کے سماجی* ر [اور سیاسی شعور کو پختہ کرے، بندہ و آقا کی تمیز ختم کرے اور بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرے، اگ ایسا Âم تعلیم مہیا کر لیا جا* تو یقینا* پکستانی سماج اپنی منزل متعین کر 8 اور آج سماج میں موجود شدی تقسیم جو بظاہر مذہبی Ã آتی ہے، سے چھٹکارا مل H ہو* * ول نگاروں نے اس پہلو کی سنگینی کا # ازہ کر لیا تھا۔ اشفاق رشید کے* ول ''شدت'' سے اقتباس دیکھئے:

> اللہ کا فرمان ہے ۔ K ن ,, ا, ہیں، محنت کشوں کی بستی میں تحر ـ کا جلسہ تھا۔ اس بستی کے ا ـ خستہ حال سرکاری سکول کے* پس سے گ رتے # ر سے بچوں کے ژ* لگانے کی آوازیں آ رہی تھیں کہ اس لمحے میرے ذہن میں شہر کے سکول گھوم گئے جہاں کے « ب میں K ن درجوں میں تقسیم ہو جا* ہے۔ یہاں بھی ہمارا « ب ا ـ نہیں۔[۲]

تعلیمی* پلیسی کے* م پہ عوام کو سہانے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ محض فائلوں کا پیٹ بھرا جا* ہے جبکہ سماجی* ہمواری کو جوں کا توں رکھا جا* ہے۔ شاہد صدیقی نے تو تعلیمی Âم اور اس کی خامیوں کو* قاعدہ اپنے* ول ''آدھے ادھورے خواب'' کا موضوع بنا* ہے:

> ''سر! آپ نے ہماری نئی تعلیمی* پلیسی کا ڈرافٹ دیکھا ہے؟''
>
> میں نے اثبات میں سر ہلا*۔
>
> ''سر! اس میں کہیں بھی سماجی* ہمواریوں کو کم کرنے کے لیے نہ کوئی وہ ژن ہے نہ ہی ایکشن پلان۔'' بینش بولی
>
> ''معاشرے کے طاقتور طبقے نہیں چاہتے کہ معاشی اور سماجی* ہموا* یں کم ہوں۔ ایسا ہونے سے ان کی اپنی* پوربیں خطرے میں پڑ جاتی ہے۔''
>
> میں نے* ت جاری رکھی۔
>
> ''تعلیمی ادارے معاشی اداروں اور سماجی فرق کو کم کرنے کے بجائے اور ,ڑھا رہے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے غریبوں کے بچے بھی اعلیٰ عہدوں پہ پہنچ جاتے تھے۔ لیکن آنے والے دنوں میں شا* ایسا ممکن نہ ہو''[۳]

اس تعلیمی درجہ بندی نے سماج کو طبقاتی Âم میں عملاً تقسیم کر رکھا ہے، یہ Âم لوگوں میں سستی ,* M، خیالات میں سطحی پن پیدا کرنے اور سماجی و جمہوری شعور اور K نی آزادی و C دی حقوق کے تصورات سے* بلد ر p میں بہت مؤ* ہے۔ سلمان صدیق اسی لیے اس ہجوم کو ''مرے ہوئے لوگ'' کہہ کر مخاطب کر* ہے:

> حکومت چو è انگر ,ی غلاموں کی آتی اور جاتی ہے، اس لیے اپنی شنا # ، تہذ $، کلچر یہ ۔ کچھ ادھورا پڑا ہے۔ بکھرا ہوا ہے۔ انگر ,وں کی، قوم سے غداری کے صلہ میں بخشی ہوئی زمینوں پہ مزارعوں اور کسانوں پہ ظلم ہو* ہے اور

> ان پر ان کے کمی ہونے کا لیبل چپکا رہتا ہے اور ایوان اقتدار میں وہی لوگ عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور انہیں اپنے مزارعوں کی طرح ہانکتے ہیں۔ اور چوè یہ . لوگ جو عوام ہیں۔ مردہ ہیں۔ مرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاتھ/ پانوں -- حر - کرنے سے قاصر ہیں۔ جمہوری$ کے* م پر مچی لوٹ میں یہ ē ہیں اور مر جاتے ہیں، یہ صرف دیکھنے میں زند+ ہ ہیں ورنہ مرے ہوئے لوگ ہیں یہ۔ ہاں جاگتے ہیں . # کوئی مذہب کا* م 8 ہے لیکن ان کی یہ بیداری جہا - کی آ ی سطح کی غمازی کرتی ہے۔[۴]

مذہبی ب* ت بھڑکا کر فسادات کرانے کے مناظر اب ہماری زند+ گیوں کے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ کہنے کو* پاکستانی سماج اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے لیکن لوگوں کے رویے اور ان کی ذہنی صلا A اب بھی* پچھتہ ہیں۔ اس کا دوش تعلیمی Âم کے علاوہ ر* - کے دV اداروں کا بھی ہے۔ ر* ستی* پالیساں بنانے والے بھی انتہائی سطحی سوچنے اور فکر کرنے کی صلا A کے حامل ہیں کیوè ان کاC دی مقصد اپنے وسائل میں اضافہ کر* ہے۔ ر* - کے ساتھ ان کی وفاداری استوار ہی نہیں ہو سکی۔ ''زمین کا دکھ'' میں محمد سعید شیخ نے ایسے ہی عوامل کو موضوع بنا* ہے کہ عوام کی ذہنی سطح بلند کیے بغیر تبد~ کے محرکات بھی جنم نہیں لے h ۔ مثلاً گڈ گورنینس کے لیے سفارشات تو مر$ کی جاتی ہیں لیکن ان کا سماج کی عملی حا - سے کتنا تعلق ہے اس سوال کا جواب تلاش نہیں کیا جا* :

> چیئرمین نے میٹنگ کا آغاز کیا۔ شرکاء کو خوش آمد+ کہا۔ ان شرکاء میں سرکاری محکموں کے افسران کے علاوہ کچھ ایکسپرٹس بھی بلائے گئے تھے۔
>
> اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے، ہمیں اس بوسیدہ Âم کو+ لنا ہوگا۔ اداروں کو فعال بنا* ہوگا۔ احتساب کے عمل کو شفاف اور مستقل Cدوں پر قائم کر* ہوگا۔ کمپیوٹر، انٹرM اور ای میل اور اآ ریمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے، اس ملک کے اداروں کی ماڈرن طر i سے ریسٹر کچر - کر* ہوگی۔ ہمارے* س ۃ* فتہ ملکوں کے علاوہ، 5 یشیا، کو* ، * ئیوان کی مثالیں موجود ہیں۔۔۔ ہم اس موضوع پر ا- سیمینار منعقد کر رہے ہیں جس کی سفارشات اس* سک فورس کی منظوری کے بعد گورنمنٹ کو بھیج دی جا N گی۔[۵]

یہی وہ دکھاوے کے اقدامات ہیں جو حکومتیں کرتی رہتی ہیں اور ہر حکومت ہر مسئلے پر ا- نئی* سک فورس بٹھا کر از سر نو سارے عمل کو ا م دینے لگتی ہے جبکہ اداروں میں اصلاح کا کام آغاز نہیں ہو* * ۔ دراصل یہ مفاد* فتہ طبقہ چاہتا بھی نہیں کہ Âم میں کوئی تبد~ پیدا کی جائے کیوè ایسا کرنے سے تبد~ کو راستہ مل جائے گا سو عوامی حق میں آنے والی تبدیلیوں کے راستے* پاکستانی سماج کے اشرافیہ طبقات* ہم مل کر مسدود ر p ہیں۔ ۃ ی کے جو پیمانے وضع کر لیے گئے ہیں یہ حقیقی پیمانے نہیں ہیں کیوè . # -- لوگوں کے مزاج اور ذہنوں میں وسعت نہیں آئے گی ملک میں مو* ئل فون کی تعداد ب* ھنے سے، تبد~ نہیں آئے گی۔ تبد~ کے اس سماجی شعور کا اظہار شاہد صدیقی نے یوں کیا ہے:

> میں چائے کی ہمراہی میں امرتیا سین (Amertyasen) کی کتاب ڈیویلپمنٹ اi فر+ م (Development as freedom) پ* ھ رہا تھا۔ جس میں ڈیویلپمنٹ* پنے کے روایتی پیمانے کو چیلنج کیا H تھا۔ اور اس کا ب اہ را - تعلق لوگوں کی آزادی اظہار اور مختلف طرح کے Freedoms سے جوڑا H تھا۔ دوسرے الفاظ میں ب* ے ب* ے ڈیم، کشادہ سڑکوں کا جال، بلند* لا عمارتیں ڈیویلپمنٹ کے لیے کافی نہیں . # -- لوگوں کو صحت، تعلیم،

آزادی افکار اور آزادی کا رمیسر نہ ہو۔[۶]

تبد~ اور~ قی کے اسی عمل کو سعید شیخ نے Ki نی عنصر کے لازمے کے ساتھ دیکھا ہے:

میری آ۔ روc تو یہ ہے سر کہ ۔# ہم اداروں اور Âم کی تبد~ اور اس کی ریسٹرکچر~ کی* ت کرتے ہیں تو ہم ا۔ بہت ۔ے فیکٹر کو Ã+ از کر جاتے ہیں اور وہ ہے Ki نی عنصر۔ Ki ن کا معیار+ لے بغیر ہم اپنا کوئی بھی ہدف پورا نہیں کر سکیں گے۔[۷]

اکیسویں صدی کا آغاز دراصل ادب، ثقافت* فنون لطیفہ سے سرد مہری کے رویے سے ہوا ہے۔ لوگ اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہیں اور صارفیت کے اس کلچر میں اشیا ان کی قوت +۔ سے جا رہی ہیں۔ اس کے* وجود غنیمت ہے کہ کچھ بہتر* ول اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اکیسویں صدی میں دو متوازی نسلیں موجود ہیں جو تخلیقی محاذ پر سرگرم ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو بطور* ول نگار اپنی پہچان گذشتہ صدی میں بنا چکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جن کے تخلیقی سفر کا آغاز تو گذشتہ صدی کے آ ی دو ، وں میں ہو تھا لیکن* ول نگاری کی طرف وہ اکیسویں صدی میں مائل ہوئے۔ اول الذکر کا نمائندہ مستنصر حسین* رڑ ہے۔ ''قلعہ جنگی''، ''ڈاکیا اور جولاہا''، ''خس و خاشاک زمانے'' اور ''اے غزال ش ۔ '' اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے* ول ہیں۔ جبکہ مؤ الذکر میں مرزا اطہر بیگ کا* م اہم ہے۔ ان کے دو* ول ''غلام* غ'' اور ''صفر سے ا۔ --'' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد حمید شاہد کا *ول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' بھی اکیسویں صدی کا قابل ذکر* ول ہے۔ اکیسویں صدی میں جن نئے لکھنے والوں نے* ول لکھ کر اپنی شنا# بطور* ول نگار کرائی ان میں سے چند کا ذکر تو ہو چکا ہے چند دV* موں میں حسن منظر، محمد عاصم $ ، زاہد حسن، وحید احمد، فرانسیسی ادھ ولیاں قابل ذکر ہیں۔

اکیسویں صدی کے ا۔ دہائی کے ز+ عرصہ میں بہت کم* ول سامنے آئے اور ان میں اچھے* ول مز+ کم ہیں۔ البتہ نئے لکھنے والوں کے* س وہ فکری توا* ئی موجود ہے کہ وہ نئے موضوعات کو* ول کا حصہ بنا سکیں۔ بقول امجد طفیل:

اگ چہ* عتبار کمیت یہ دہائی کوئی اتنی* ر آور نہیں ہوئی کہ دس H رہ۔ سوں میں تیس چالیس* ول کی اشا (تو کچھ ایسی خوش کن* ت نہیں ہے 1 اگ معیار پہ نگاہ ڈالی جائے تو اس دہائی میں چند ایسے* ول ضرور سامنے آئے ہیں جنہیں ہم اردو* ول کی روا$ میں بھرپور اور جان دار اضافہ قرار دے h ہیں۔[۸]

حسن منظر کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس اگ وہ سے ہے جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی شنا# بنائی۔ البتہ بطور* ول نگار ان کی شنا# اکیسویں صدی میں ہوئی۔ ان کا پہلا* ول ''دھنی بخش کے بیٹے'' سندھ کے دیہاتوں کی ز+ گی اور طبقاتی Âم کا بیا6 ہے۔ اس* ول کا ما۔ ا کمزور ہے اور Ã* تی مبا # کے ذریعے مصنف اپنے عصر کے حالات واضح کر* چاہتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کرداروں کے ذریعے کہا M کو فروغ* ارتقا 5 ہے وہ حصے* دہ دلچسپ ہوگئے ہیں گاؤں کے جاگیردار اور عام افراد کی ز+ گیوں کے مابین جو سماجی فاصلے اور معاشی تفاوت ہے وہ اس* ول کا موضوع ہے۔ طبقاتی Âم اس حد- سماج کی رگوں میں سرا$ کر چکا ہے کہ ذرا شعور سنبھالنے پہ لوگ خود بہ خود اسے اپنا e ہیں:

مشکل یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ۔ے ہونے پہ خود اپنی شنا#+ ل دیتے ہیں۔ ۔ی آسانی سے حاکم اور محکوم بن جاتے ہیں۔ ساتھی نہیں رہتے۔ خواہ اس کی توقع ان سے کی جائے* نہیں، کم حیثیت پہ انے دو - ۔# ملتے ہیں ایسے ملتے ہیں جیسے غلام ہوں اور* حیثیت پہ انے ساتھی خود اسے اپنا بیاج سمجھنے لگتے ہیں جسے ادا کر* ان کے ۔ د۔

کم حیثیتوں ,پ فرض ہو* ہے۔[۹]

المیہ یہ ہے کہ جبر کا یہ Âم اکیسویں صدی میں بھی قائم ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اقتدار ,پ ., اجمان طبقات سماج کی صورتحال کو+ لنا بھی نہیں چاہتے۔ مثلاً مذکورہ* ول میں .+ ی نز+ گی کی تمام آسائشیں گھر میں موجود ہیں لیکن گھر کی خواتین بھی ویسی ہی گنوار ہیں جیسی دیہات کے ہاریوں کی خواتین جاہل ہیں* ول قدیم اور .+ ی نز+ گی کے تصادم سے آگے ,ڈھتا ہے:

> اس (* ول) کی آئیڈ* یلوجی دو تہذیبوں کا تصادم ہے جس کو حسن منظر نے* ول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ اور اس میں* پ ئی جانے والی ., ائیوں اور کمزوریوں کو منظر عام ,پ لانے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم کو کچھ ایسے عمل کے ذریعے سماج کے سامنے رائج کیا کہ لوگ اسے فطری سمجھتے ہیں اور جو کچھ بتانے کی کوشش کی ہے اس ,پ کسی حد- قاری متفق بھی ہو جا* ہے۔[۱۰]

اکیسویں صدی میں بھی قائم جاگیردارانہ سماج* ول کا موضوع ہے۔ گو کہ یہ طبقاتی سماج ا- مسلسل* ر [عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے لیکن .+ ی تصورات، جمہور $ ، Kl نی آزادی وغیرہ نے استحصال کی C ی د,پ قائم اس Âم کو+ لنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ احمد بخش ا- ایسا کردار ہے جو اپنے گاؤں کی حد- سماجی تبد~ لا* چاہتا ہے لیکن وہ اس عملی قوت سے محروم ہے جو استحصال ,پ قائم Âم اور لوگوں کے رویے+ لنے کے لیے درکار ہوتی ہے:

> احمد بخش نے کئی* .ر اپنے ملنے والوں کو کر+ ی کر دیکھا کہ ان میں بہ ظاہر آتش فشانی چٹانوں کے پتھروں جیسے سروں میں کسی بہتر نز+ گی کی خواہش ہے بھی* ی نہیں، وہ سوچتا تھا اَ/ دو چار ایسے آدمی مل جا N جو لوگوں کے لیے بہتر نز+ گی پیدا کرنے کی خواہش ر p ہوں تو وہ اولا کو فون ,پ بتائے گا کہ ہمیں اپنے ,پ واَ/ ام کے لیے چند ساتھی مل گئے ہیں۔ لیکن معاملہ یوں تھا کہ ان لوگوں کو بے چارگی اور بیماریوں کے مسئلے میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کام : اکے کرنے کا تھا کیوں کہ اس نے * ی دہ- کو غری $ اور محتاج بنا* ی تھا اور کچھ کو معقول اور صحت مند۔[۱۱]

تقدی ,پ ستی دراصل سرمایہ دارانہ سماج کا خاص ہتھیار ہے۔ اس Âم اور اس کی مکاریوں کو نو* .* ی تی سامراج نے مز+ ی مستحکم کیا تھا اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کے ہمدرد اور خیر خواہ اسے ., قرار رکھے ہوئے ہیں۔ نئے صنعتی تمدن نے شہری سماج میں* .لخصوص معاشرت، اجنبیت، احساس تنہائی، عدمیت، لغوی $ جیسے ابعاد کو جنم * ی ہے۔ Kl ن مرا/ مہا بیانیے ختم ہو گئے ہیں درحقیقت Kl ن کی مرا/ .$ کی جگہ اشیاء کی مرا/ .$ نے لے لی ہے۔ اس سے ا- نئ صورتحال نے جنم لیا ہے۔ جہاں فرد کا سماج سے رابطہ منقطع ہو رہا ہے اور سماجی شکست و ریخت کا عمل مز+ ی گہرا ہ H ی ہے۔ محمد عاصم .$ کا* ول شہری نز+ گی اور فرد کی اکائیت ,پ مشتمل ما. ا ہے جہاں فرد نے اپنی شنا# گم کر دی ہے کیو è وہ اب کائنات کا مرا/ ہ رہا ہی نہیں۔ عاصم .$ کے افسانوں او* ول ''دائـرہ'' کا موضوع بھی نز+ گی کے بے معنوی $ ، لغوی $ اور بے کیفی ہے جو .+ ی Kl ن کا المیہ بن چکی ہے۔ عاصم .$ کے* ول ''دائــــرہ'' میں خلا ہے بھی اور نہیں بھی۔ Kl ن جنم 8 ہے اپنا کردار نبھا* ہے اور مر جا* ہے اور اس کی جگہ دوسرے Kl ن لے e ی ہیں گو* ی نز+ گی ا- دا/ ہ ہے۔ یوں بھی ممکن ہے کہ Kl ن کی تقدی دا/ وی ہے۔ جو المیہ* ی دکھ وہ نسلوں سے سہتا آ رہا ہے وہ آج بھی سہتا ہے۔ عاصم .$ کے کردار نز+ گی کی ظاہری چکا چو+ سے اکتائے ہوئے کردار ہیں اور فی زمانہ صارفیت کے کلچر نے سیاسی و سماجی منظر* مے کو تبدیل کر کے رکھ * ی ہے۔ Kl ن اپنی شنا# بطور Kl ن کھو چکا ہے۔ اس کا تعارف اشیا بن گئی ہیں اور وہ ''اشتہار آدمی'' بن H ی ہے:

> اس دور میں زندگی اس قدر الجھ گئی ہے کہ انسان اپنی پہچان بھول کر اس مصنوعی دنیا میں کھو گیا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ اپنے باطن میں جھانک سکے۔ لیکن محمد عاصم بٹ کے ناول ''دائرہ'' کے کردار راشد کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنی پہچان چاہتا ہے۔ وہ اپنے اندر خود کو تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس طرح پوری کہانی دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔[12]

راشد ایسا کردار ہے جو شناخت کے بحران کا شکار ہے اور جب فرد سماج میں کوئی شناخت ہی نہ رکھتا ہو تو زندگی اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرت اجنبیت کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ دراصل یہ ایک کردار نہیں بلکہ یہ سماج کا نمائندہ کردار ہے جو مابعد جدید صورتحال میں فرد فرد سے کٹ چکا ہے اور اپنی مرکزی حیثیت سے دستبردار ہو چکا ہے لیکن وہ افراد جو سوچتے ہیں اور سماج میں انسان کو مرکز سمجھتے ہیں ان کے لیے زندگی اور سماج اجنبی ہو چکے ہیں سو وہ عدم شناخت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ''دائـــــرہ'' میں یہ کیفیت کرداروں کے ساتھ آغاز سے ہی موجود ہے۔ مثلاً راشد کردار جو مختلف کرداروں کے بہروپ بھرتا ہے بالآخر اپنی اصل شناخت کھو بیٹھتا ہے اور اپنی منگیتر کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے:

> میں اب مزید یہاں نہیں رک سکتا۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں میری وجہ سے آپ کو ذہنی کوفت ہوئی۔ آپ نے کھانا کھلایا بہت اچھا پکا ہوا تھا۔ بہت شکریہ۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کی مدد کرتا راشد صاحب کو تلاش کرنے میں مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا کہ جسے آپ اپنا خاوند سمجھ رہی تھیں وہ اصل میں کوئی اور ہے مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔[13]

مابعد جدید تصورات نے معنی کی تہہ داری کے جنم میں دراصل انسان کی تہہ در تہہ ذات کے المیے کو بھی جنم دیا ہے۔ اور یہ المیہ عدم شناخت یا انسان کی حتمی شناخت کا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ناول ''دائرہ'' کو پر اسرار ناول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آصف مراد اور راشد ہی نہیں اس معاشرے کے ہر فرد نے ایک چہرے پر دوسرا چہرہ لگا رکھا ہے۔ اس دنیا کی فلم کے اداکار ہیں اپنی زندگی کے ڈرامے کا سکرپٹ بھی ہر شخص نے خود لکھا ہے۔[14]

عاصم بٹ کے کرداروں کا تعلق شہر کے جدید تمدن سے ہے اور جو اشتہاری کمپنیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور اشیا کے ہجوم میں کھو کر رہ جاتے ہیں یہ تمام کردار عام اور مروج اخلاقی اقدار سے محروم ہیں۔ دراصل تیزی سے بدلتی زندگی کا ساتھ دینے میں یہ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اس لیے اب زندگی سے لاتعلقی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی اکیسویں صدی کے انسان کا المیہ ہے کہ اسے زندگی مجہول نظر آتی ہے۔ مقصدیت سے تہی اور بے سمت زندگی ان کرداروں میں سماج کے اندر اور سماج کے ساتھ معاشرت اور اجنبیت کا احساس گہرا کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ملک میں ایک اور فوجی استبداد کا عہد آغاز ہوتا ہے لیکن لوگ اسی خول میں دبکے بیٹھے ہیں۔ ان کی لاتعلقی مزید بڑھتی جاتی ہے:

> مارشل لا ایک عرصے سے کسی بھیانک خواب کی طرح ملک پر مسلط تھا۔ گو جب ایسا ہوا تو بہت پہلے سے اس سے متعلق مختلف حلقوں میں پیش گوئیاں کی جا رہی تھیں۔ لیکن لوگ ایسی فوری فاناً ہونے والی تبدیلیوں کے عادی ہو گئے تھے ایک صبح اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر سے کہ اسمبلیوں کو منسوخ کر کے فوج نے ملکی انتظام کو سنبھال لیا ہے، عوامی سطح پر بظاہر کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ جیسا کہ کچھ پہلے تھا، الٹا سیدھا، بے ڈھنگا، وہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا۔۔۔ لوگ بے فکر تھے۔[15]

لاتعلقی، اجنبیت اور معاشرت سے عدم دلچسپی وغیرہ اس خاص عہد جسے مابعد جدید کہا جا رہا ہے، کی دین ہے اس کا اظہار ناول نگاروں کے ہاں بھی ہوا ہے۔ محمد حمید شاہد کا شمار معتبر اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا اردو ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' منظر عام پر آیا۔ امجد طفیل اس ناول کے ما بعد جدید ہونے کی تہہ داری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

ناول میں بیانیہ ایک سے زیادہ سطحوں پر جاری ہے۔ راوی در راوی کی تکنیک نے ''مٹی آدم کھاتی ہے'' میں معنوی تہ داری پیدا کی ہے۔ اپنے، اپنوں کی موت کا منظر ہیں۔ رشتے ٹوٹتے ہیں اور نئے جڑتے ہیں۔ زندگی بس ایک نشیب میں لڑھکتی جا رہی ہے۔ یہ ناول اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں ناول نگار نے المیہ مشرقی پاکستان کو ہماری تہذیبی زندگی کے دائرے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔[۱۶]

سانحہ مشرقی پاکستان اس ناول کا موضوع ضرور ہے لیکن جس تہذیبی زندگی کی طرف امجد طفیل نے اشارہ کیا ہے وہ واضح اظہار نہیں کرتی۔ ویسے بھی مابعد جدید فکریات میں سے ابہام اس ناول کی خصوصیت ہے۔ بہت سے سوال اور منظر ناول نگار ان کہے چھوڑ جاتا ہے۔ ناول نگار کے سماجی شعور میں یہ امر راسخ ہو چکا ہے کہ عوام ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں گویا سماج کے عام افراد حقائق سے آشنا نہیں ہوتے لیکن وہ ایک سرا می نہایت تندہی سے سرانجام دے رہے ہوتے ہیں یہی کا فکائی اثرات ہیں جو عاصم بٹ کے ناول میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے اقتباس میں التباس حقیقت کی مثال دیکھئے:

اب تک کی فوجی زندگی میں یہی دیکھا گیا تھا کہ افسروں اور جوانوں کی چھاتیاں کسی بھی ان جانی مہم پر جانے سے پہلے کچھ ولولوں سے بھر جایا کرتی تھیں اور اس کا جواز شاید اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ ہمارے محسوسات کو کمال آ۔۔۔ اور چالاکی سے مرتب کیا جاتا کہ ہم اسے ہی سے ارفع انسانی قدر سمجھنے لگتے تھے۔ ایک ایسا مقدس فریضہ جس کے آگے انسانی وجود۔۔۔ ہیچ ہو جاتا۔ وہ انسانی وجود جس کا عکس تختے پر بنا کر ہمیں نشانہ باندھنا سکھایا جاتا اور ہم اس میں اتنے طاق ہو جاتے تھے کہ عکس کو اصل سے بدل دیا جاتا تو بھی ہمارا نشانہ نہ چوکتا۔[۱۷]

سانحہ مشرقی پاکستان پر بہت کم لکھا گیا لیکن یہ ایسا سانحہ نہیں ہے کہ جسے حساس فنکار فراموش کر سکیں سو آج بھی یہ سانحہ کسی نہ کسی صورت ناول یا افسانے میں اپنا اظہار پاتا ہے۔ اس کے ایک ... اہ را ... معنی تو یہ ہیں کہ اس سانحے کو ابھی کسی بڑے تخلیقی ذہن اور تخلیقی عمل کی تلاش ہے، اس سانحے کی نمود حمید شاہد کے ناول میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے:

جس شکست کی میں بات کر رہا ہوں وہ ہمارے اپنے ہی کارن ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ یہ محض جنگ کا واقعہ نہ تھا۔ صاحب ہم نے ہتھیار ڈالے تھے بلکہ یہ قسطوں میں ہمیں رسوا کر رہی تھی۔ تم یہ بات نہیں سمجھو گے تم اس بات کو، اپنی حقیقی شدت کے ساتھ سمجھ ہی نہیں پاؤ گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر کے لوگ بنگالیوں کو صحیح طرح سمجھ ہی نہیں سکے۔ یہاں ڈنڈے سے، روپے پیسے سے یا پھر مرعوب کر کے سارے کام نکالے جا سکتے ہیں۔ یہاں کے خان جی، چودھری صاحب، ملک صاحب، وڈیرا سائیں اور پیر صاحب اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے تم اور تمہارے باپ جیسے لوگوں سے ووٹ بھی لے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کے کامی، مزارعے، رعایا یا پھر ارادت مند ہوتے ہیں۔۔۔
1 ادھر کا عام بنگالی ایسا نہیں تھا۔[۱۸]

ناول نگار نے اس مختصر اقتباس میں ملک کے دونوں حصوں کے سماجی و سیاسی شعور کا تقابل کر کے دکھایا ہے کہ عام بنگالی آزادی کی حقیقی روح کو سمجھ چکا تھا جبکہ مغربی حصے میں نوآبادیاتی نظام ابھی تک آقا و غلام کے امتیاز کے ساتھ قائم ہے اور آج بھی

صنعتی سماج میں بھی اس Âم میں سرمو تبد ~ نہیں آئی۔

۰ ول میں ''مٹی'' کا استعارہ بلیغ ہے۔ مٹی یعنی زمین کے حصول کی خواہش اپنے جیسے Ǩ نوں کے استحصال پہ اکساتی ہے بلکہ ان کا قتل بھی کرا دیتی ہے چاہے بنگال کی مٹی (زمین) پہ اپنا قبضہ قرار رکھنا ہو مٹی کا قرض چکا ہو دونوں صورتوں میں مٹی آدم کو کھا رہی ہے اور آدم جو وجہ تخلیق کائنات ہے وہ اسی مٹی کی+ رہو رہا یہی آج کے Ǩ ن کا المیہ ہے جسے* ول نگار نے بخوبی بیان کیا ہے۔ *۰ ول کے C دی استعارے ''مٹی'' کی مز+ اَ ہیں کھولتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان* ول کے ما. ے کا احاطہ یوں کرتے ہیں:

> *۰ ول کی مجموعی خوبی یہ ہے کہ وہ ''مٹی'' کی بہرصورت تفہیم کرا دیتا ہے۔ اسے پڑھ کر ا- سوال ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ: اتعالیٰ نے Ǩ ن کو مٹی سے کیوں تخلیق کیا اور مٹی ہی میں سپرد کرنے کا حکم کیوں* H۔ اس امر کو بھی سمجھنے سے* ول کے ما. ے کی اَ ہیں کھلتی چلی جا N گی۔ آ· ''مٹی'' ہی تو اس کا فکری محور ہے۔ مٹی کی محبت میں دیوانے ہو جانے والوں کی نفسیاتی اَ ہ کشائی ہمیں بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کرتی ہے۔ مٹی کی محبت کے بھیا- ا م پہ غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ* ت دور- چلی جاتی ہے اور مٹی کے ابعاد (Dimensions) کو بھی واضح کرتی جاتی ہے۔[19]

اردو* ول نگاری کے* رے میں عام* یہی تھا کہ چند ا-* ولوں کے بعد اب عمومی طور پہ یہ صنف ادب سے غا$ ہوتی جا رہی ہے۔ اس* کو ابھارنے میں دراصل ہمارے سماجی رویے بھی عامل کا کردار ر p ہیں کہ ہمارے سماج میں* ول کا چلن عام نہیں ہوسکا کیو è ہماری تہذR پہ دا # غزل کی ہے حالا è غزل سے قبل اشاعر اسے تسلیم کیا جا* تھا جو مثنوی میں کمالات دکھا* تھا* ہم کسی حد- یہ امر در - بھی ہے کہ د* بھر میں* ول کی صنف کی مقبولیت کے* وجود اردو ادب میں یہ صنف تنزلی کا شکار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہاں سرد - یہ ذکر مقصود ہے کہ . # یہ غلغلہ بلند ہوا کہ* ول غا$ ہو رہا ہے کہ اسی دوران مرزا اطہر بیگ ''غلام باغ'' اور پھر ''صفر سے ایك تك'' دو اہم* ول لے کر منظر پہ ابھرے اور اس ڈوبتی صنف کو سہارا* ۔ غلام باغ کا پیچیدہ اور تہہ دار بیا6 معاصر تہذR صورتحال کو پیش کرنے کے لیے نہا$ منا . ہے کہ* پکستانی سماج میں à و پولیٹن شہروں کی ز+ گی اتنی ہی تہہ دار اور گنجلک ہوچکی ہے۔ گو کہ ان میں موجود C دی سہولتیں د* کے . + شہروں والی نہیں ہیں 1 ز+ گی کی رفتار اسی قدر تیز اور بے سمت ہے۔ جبکہ ذرا ان شہروں کے مضافات میں جا N تو قدیم قبائلی سماج میں اپنے پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہیں جو اپنی صدیوں پہ انی بوسیدہ رو* یت اور طرز ز+ گی کو کندھوں پہ اٹھائے ہے اور اس سے د - کش ہونے کو تیار نہیں۔ اسی تہذR ز+ گی کی تہہ داری کو پیش کرنے کے لیے مرزا اطہر بیگ نے* ن کے ساتھ بھی خاصا انوکھا* ؤ کیا ہے۔ وہ اردو* ن کو اپنے ڈھب سے استعمال کرتے ہیں اور . + تنقیدی ادبی Ã* یت کا اِ ان کی تشکیل* ن پہ واضح دکھائی دیتا ہے۔* ول میں اطہر بیگ نے کبیر کو جو کہ لکھاری / مصنف ہے، مرا· ی کردار بنا کر شا+* لواسطہ طور پہ لکھاری کی موت کے Ã یے کی تکذ$ کی ہے۔

Ǩ ن نے خود اپنی تہذ$ کی ہے۔ خود اس نے ایسے Ã* یت وضع کیے جو متمدن کہلاتے ہیں اور پھر ان پہ عمل کر کے وہ متمدن کہلا* ۔ یہاں سوال پیدا ہو* ہے کہ یہ قوا 2 خود کتنے متمدن ہیں؟ ارزل نسلوں کو بظاہر متمدن کہلانے والے Ǩ ن خود میں* اپنے. ا. آج بھی جگہ دینے پہ آمادہ نہیں ہیں۔ اور اَ کوئی مانگر جاتی کا فرد کسی نہ کسی طرح متمدن افراد کی. ا. ی کا حوصلہ کر لے تو بقول مصنف آج بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جا* ہے کہ وہ آئندہ نسلوں اور د V اپنے ہم زادوں کے لیے سامان عبرت بن جا* ہے:

خادم حسین کا تعلق سوکٹر نہر کے کنارے *۔ د مانگر جاتی سے تھا۔ اسے وہیں *۔ د رہنا چاہیے تھا۔1 وہ کسی نہ کسی طرح Åام اُ ھ کے کا چھر اور پگل چوہدریوں کے درمیان ا یہ ڈاکیا بن کر آبسا۔ قصبے کی یہ سردار نسلیں مانگر جاتی کو ارذل کاموں اور اسفل دھندوں کے لیے بہت موزوں سمجھتی تھیں۔ اس کے *۔ وجود خادم حسین اپنے آپ کو ا یہ *۔ $ دار، فرض شناس، ۔ ات مند حتیٰ کہ خود دار ڈاکیا بنائے رکھتا تھا اس کا یہ رویہ بعض اوقات خا* انی لوگوں میں ا یہ جھنجھلاہٹ آمیز تنفر کا *۔ (بن جا* تھا اور عجیب معمہ Ã * تھا۔[۲۰]

اعلیٰ © کے لوگ یہ گمان بھی نہیں کر h کہ ارزل نسلوں میں بھی ایسے فرض شناس لوگ موجود ہو h ہیں اس لیے وہ حیران ہوتے ہیں اور ایسے کسی فرد کو جو فرض شناس ہو کسی اعلیٰ ذات اور © ر p والے کی* جا ئز اولاد تصور کرنے لگتے ہیں کیوè:

چند کا چھر اور پگل ,, رگوں کو اس اچنبھے کی وجہ صاف Ã آتی تھی۔ ''عطر گندی* لی میں بھی بہہ جائے تو تھوڑی بہت خوشبو پھر بھی دے دیتا ہے۔'' ۔ اس رمزیہ *۔ ت کی اصل سمجھ h تھے اور خوب ہنستے تھے۔ ۔ جا... تھے کہ مانگر عورتیں ان کے گھروں میں : مت اُ اری کرتی ہیں اور ایسے ہی روا داری میں کبھی کبھار وہ اپنے مانگر خا* وں کی ولد $ کے شبے میں کوئی نسلی بچہ جننے ,, بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔[۲۱]

حاکم دین کا Œ والا ہو*۔ ماسٹر کرم الٰہی جو بھی مانگر جاتی میں سے ارزل کاموں کے علاوہ کوئی*۔ عزت پیشہ اختیار کر* ہے اسے عبرت کا نمونہ بنا *۔ جا* ہے۔ یہی المیہ عہد ,+ میں بھی سماج کے نیچ کہلانے والے طبقات کے ساتھ روا رکھا جا* ہے۔ ''غلام *۔ غ'' میں تشکیل دی جانے والی فضا فرضی ہونے کے *۔ وجود اسی لیے حقیقی Ã آتی ہے کہ ہمارے آس *۔ س کی د* اس میں سانس لے رہی ہے۔ ''غلام *۔ غ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر امجد طفیل کا کہنا ہے:

اُ چہ* ول نگار نے سیا ۔ و معاشرت ,, *۔ ت کم کم کی ہے لیکن *۔ لواسطہ طور ,, معاشرے کا جیسا اچھا تجزیہ اس* ول میں موجود میں ہے ایسا کم کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''غلام *۔ غ'' میں ہماری سیاسی سماجی صورت حال اپنی تمام ہولنا کی کے ساتھ موجود ہے۔ فرد کی دیوانگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی دیوانگی۔۔۔ ۔ سے ,,ا کردار کبیر مہدی اس دیوانگی کا مجسمہ ہے جو اپنی موجودہ صورت حال میں ڈرامائی تبد~ پیدا کر* ہے۔۔۔ طاقت کے جنون میں مبتلا افسر، سیا ۔ دان اور دو ۔ مند اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو کس طرح تباہ کر* ہے اور معاشرے کے* رو پود بکھیرنے میں مبتلا ہے اس کی بہت اچھی تصو یکشی ہمیں اس* ول میں دکھائی دیتی ہے۔[۲۲]

*۔ ول کے کرداروں اور واقعات میں دیوانگی اور *۔ گل پن کی کوئی خاص وجہ ہوگی؟ اس کی تعبیر کرتے ہوئے مرزا اطہر بیگ نے اپنے ا یہ انٹرویو میں کہا ہے:

ہاں، دیوانگی ''غلام *۔ غ'' کے C دی موضوعات میں سے ا یہ ہے، فلسفے کے طا ۔ علم کی حیثیت سے بھی یہ موضوع مجھے بہت Fascinate کر* ہے، ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ فرزانگی اور دیوانگی میں *۔ ل ,, ا, فرق ہے۔ دیوانگی کا موضوع* ول کے پلاٹ سے بھی متعلق تھا۔ اس* ول میں ا یہ اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں *۔ ن کردار کے طور ,, سامنے آتی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دیوانگی ,,ی حد - ا یہ لسانی مسئلہ ہے۔ # ہمارے لسانی Âام میں کسی سطح ,, بگاڑ پیدا ہو* ہے، $ ہی دیوانگی کا اظہار ہو* ہے۔۔ *۔ ت دیوانگی ,, ائے دیوانگی ,, ختم نہیں ہوتی، بلکہ یہ وجود کی، Ḱا ن کی Ḱا ن سے تعلق کی ا یہ اور سطح تلاش کرنے کی کوشش ہے۔[۲۳]

٭ول کے غلام ٖغ میں یورپ* ٖشندے کی موجودگی ش+ اس مغرب* ٖلادستی کی طرف اشارہ ہے جو قبل ازیں بلاواسطہ اور اب *ٖ لواسطہ ہمیں تہذ$ کا درس سکھا رہے ہیں اور ش+ ہم لوگ جو اپنی اصل تہذR ورا$ د*ٖ یفت کر* چاہتے ہیں اس د*ٖ یفت میں بھی ان کے محتاج ہیں۔ گو* آج بھی نو* *ٖ تی ا* ات سے سماج نکل نہیں** جو کہ حقیقت ہے۔ یعنی ہم آج بھی تہذR تشخص کو مغرب کے ذریعے دیکھنے پ مجبور ہیں۔ ظاہر ہے یہ علمی وتکنیکی محتاجی $ -- رہے گی ۔ # -- ہمارے قلم کار جیسے کبیر ہے، وہ نہیں لکھتے جو وہ لکھنا چاہتے ہیں، ورنہ عوام کو محض تماشا دکھاتے رہنے سے تبد~ کا عمل وقوع+ ٖ * ممکن نہیں ہے۔ کبیر مہدی*٭ول میں تبد~ کی قوت لے* ہے لیکن اس کی علمیت محض طنزیہ جملوں اور بے* ٖ کی سے آگے نہیں پ*ھتی:

> وہ ذہنی اور علمی سطح پ ٖ سے آگے ہے لیکن اپنی قومی زبوں حالی اسے ا- ایسے*٭ کارہ فرد میں تبدیل کر دیتی ہے جو فرضی*٭ول سے قلم کی مزدوری کر کے اپنی روزی کما* ہے اور اصل تخلیقی کام جو وہ کر* چاہتا ہے کبھی نہیں کر**۔ ایسے میں کبیر پسما+ ہ ممالک میں بسنے والے تخلیق کاروں کے استعارے میں ڈھل جا* ہے۔[۲۴]

''غلام باغ ''*پ کستانی سماج میں رائج* ر [جبر کی بھی K+ ہی کر* ہے جو یہاں صدیوں سے اشرافیہ طبقات نے رائج کر رکھا ہے، یہ اعلیٰ طبقات کمتر طبقات کا استحصال کرتے ہیں اور یہ استحصال فقط کمتر طبقات کی محنت پ انے کا نہیں بلکہ ان کی ذہا$ پ انے کا بھی ہے۔ ٖ+ عہد کا یہ بھی المیہ ہے کہ طاقتور اقوام تیسری د* کے ذہین دماغوں کو ہر طرح کی آسائش دکھلا کر لے جاتے ہیں اور ان سے اپنے ممالک اور اقوام کی ٖ" قی کے کام e ہیں ایسا + گی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے۔ یہاں بھی اخبار نویس* مدیر عصری ڈائجسٹ کی خواہش کے مطابق تخلیق کار کبیر کو کام کر* پ* ہے۔ دراصل مدیر کو بھی عوامی خواہشات کا احترام کر* پ* ہے۔ کیوè اس کے مفادات بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے سے مکمل ہوں گے ایسے ہی کبیر کا رزق بھی ایسے کام سے وابستہ کر* H ہے جو اسے پسند نہیں:

> کبیر نے قہقہہ لگا ٖ، میں ا- کرائے کا اد$ ہوں سر بلکہ اد$ ش+ *ٖ دہ* ٖ عزت لفظ ہے۔ میں ا- کرائے کا لکھنے والا ہوں جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں*٭ں جی۔ I am a mercenery writer sir۔۔۔ د* کے کسی موضوع پ* ٖ ئے جانے والے کسی بھی قسم کے نقطۂ Ã کو* $ کرنے کے لیے پورے مدلل طر j اور مکمل روانی طبع سے لکھ سکتا ہوں کوئی بھی آ جائے معاملہ طے کر لے اور کچھ بھی لکھوا لے۔۔۔[۲۵]

بعینہ یہی صورت* ور » ئی کی بھی ہے۔ وہ بھی ارزل نسلوں کا úئندہ ہے لیکن جنسی طاقت کی دوا بیچتا ہے اور امرا و اشراف اس کے گاہک ہیں*٭ول نگار نے یہاں بھی علامت سے کام لیا ہے۔ یعنی اگ ارزل نسلوں کا کوئی فرد سماج کی کسی خامی کو مٹا* چاہتا ہے تو اعلیٰ طبقات اسے بھی اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جنسی قوت کے ا- معنی یہ بھی ہیں کہ اعلیٰ طبقات اپنی چالاکی سے ارزل نسلوں کی ذہا$ کو استعمال کر کے ان نسلوں کو ہی اپنا غلام بنائے ر p ہیں ۔ اس لیے*٭ول کا ا- موضوع غلامی بھی ہے۔ اور یہ غلامی ا- قوم کے + رمختلف طبقات سے لے کر عالمی سطح پ ٖ" قی* یفتہ اور ٖ" قی+ ٖ طبقات -- پھیلی ہوئی ہے۔ صدیوں کی یہ* ر [جبر $ لوگ قبول کیے ہوئے ہیں۔ یہ *ٖ دہ بھیا -- اور فکر انگیز پہلو ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا دوسر*٭ول ''صفر سے ایک تک'' ہے۔ جس طرح ''غلام باغ'' میں K ن K نوں کو غلام بنا رہے ہیں۔ یہاں بھی صورتحال ایسی ہے۔ ± در± چلتی غلامی عہد ٖ+ میں محض اپنی صورت+ ل لیتی ہے۔ زمین پ مزارع اور منشی کا کام کرنے والے کرداروں کی منشی کی ہئیت سائبر سپیس میں بھی نہیں+ ل لی:

''صفر سے ا یـ -- '' سارے کا سار*ٔ ول کمپیوٹ ,ٖ پا امنگ، انٹر M اور اس کے استعمال کی نئی نئی دڑ یفتوں کا بیا 6 ہے *ٔ ول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کمپیوٹ ہمیں ا یـ اور ہی د* کی شے Ã ** ہے۔۔۔ سائبر سپیس کا منشی جو *ٔ ول کا C دی کردار ہے وہ کمپیوٹ ,ٖ پا امنگ اور نئی نئی و $ سا $ سے قاری کو متعارف کرو* ہے اور مختلف قسم کی گیمز (K نی گیمز) سے آشنائی کرو* ہے۔[۲۶]

مذکورہ *ٔ ول اپنی لسانی تشکیل کے حوالے سے ''غلام* غ'' کا تسلسل ہے۔ ''سالار'' کا کردار دراصل * لا د -- طبقات کا کردار ہے جو ہمیشہ سے ہیں اور * پ کستان کی سماجی صورتحال دیکھ کے لگتا ہے کہ ہمیشہ رہیں گے۔ سماج کے * لا د -- اور اشرافیہ طبقات جو خود کو خا# انی اور نسلی کہلاتے ہیں دراصل + طینت اور استحصالی کردار ہیں۔ لوگ ان کے لیے کارآمد چیزیں ہیں اور . # ان کی ضرورت ختم ہو جائے انہیں N * جا* ہے۔ گو *ٔ ول عہد + میں K ن کے استحصال کو موضوع بنا* ہے۔ اقبال خورشید کے ساتھ ا یـ انٹرویو میں *ٔ ول ''صفر سے ا یـ -- '' کے موضوعاتی دا ٔ ے کی وضا # کرتے ہوئے مرزا اطہر بیگ کا کہنا تھا:

> ۹/۱۱ کا حوالہ اس میں ضرور * ہے۔ لیکن وہ C دی موضوع نہیں۔ اس کا اصل موضوع کمپیوٹ ا ٔ c * ڈ ´ انقلاب تھا۔ جس نے ہمارے معاشرے ,ٖ بھی گہرے ا ات مر $ کرنے شروع کر دیے ہیں۔ میرے سامنے سوال تھا کہ جو سائبر اسپیس کی د* بنی ہے، وہ ہمارے روایتی تصورات، جاگیرداروں او* م نہاد دانشوروں ,ٖ کس طرح ا # از ہو رہی ہے۔۔۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موضوع کے اعتبار سے یہ *ٔ ول لمحہ حال کی د* کی، غیر معمولی پن کا احاطہ کرنے کی کوشش کر* ہے۔[۲۷]

اکیسویں صدی کے موضوعات میں بھی تنوع ہے۔ صارفیت کے کلچر نے * پ کستانی سماج کی اخلاقی اقدار اور روحانی اساس کو زک پہنچائی ہے اسی طرح میڈ یـ کی ,ٖ ڈھتی ہوئی یلغار بھی ابھی -- مثبت سرا می نہیں دکھا سکی۔ انٹر M اور دV ذرائع نے معلومات -- رسائی آسان کر دی ہے لیکن ذہنی " M اس سطح کی نہیں ہوسکی کہ سماج ان سے فو# حاصل کر سکتا۔ عالمگیر $ ، مابعد سرمایہ دار $ ، دہشت ا دی، C دہ ستی، عالمی تنازعات، افغان امریکہ B وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو کسی حد -- اردو *ٔ ول کا موضوع بنے ہیں۔ لیکن ان آفاقی مسائل کی کھوج اور حل -- ابھی تخلیقی فنکار دسترس نہیں کر سکا۔ ۹/۱۱ کے بعد یـ قطبی ہو جانے والی د* مز + امریکی سامراج کے عزائم کا K نہ بنی ہوئی ہے۔ اس صورتحال میں * پ کستانی سماج * لخصوص عالمی و علاقائی حالات سے شد + متا ہو رہا ہے۔ * پ کستان کی سرحدوں ,ٖ عسکری شدت پسندی کا * ؤ، فرقہ وار $ ، نسلی ولسانی تنازعات، قبائلی جھگڑے + *ٔ ول کا موضوع ہیں۔ ,ٖ ڈھتی ہوئی صارفیت، ز* گی کی خالصتاً کمرشل C دوں ,ٖ تعبیر، اشیا کی اہمیت، حقیقت کا B س، عالمی کلچر کے ا ات، احساس تنہائی، وجودی کرب، ز* گی سے مغا ٔ ت اور عدم دلچسپی، مسائل کا در -- ادراک نہ ہو* ، فکری و Ã * تی الجھنیں اور غیر یقینی صورتحال بھی *ٔ ول میں Ã آنے والے موضوعات ہیں۔

عدم شنا # ، K نی قدروں کی شکست و ریخت، قدیم اور + میں تصادم، متصادم مذہبی Ã * یت سے K نی ذہن میں جنم لیتی تشکیک اور غیر یقینی صورتحال بھی *ٔ ول کا موضوع " Ã آ رہی ہے۔ البتہ ابھی اردو *ٔ ول کے دا ٔ ے میں وسعت کی گنجائش موجود ہے کیو è یہی وہ صنف ادب ہے جو تنگ دامانی کا شکوہ نہیں کرسکتی اور اسی صنف میں K نی شکست و ریخت اور درد و کرب کا ,ٖ ا تخلیقی اظہار کسی حد -- ہوا بھی ہے لیکن ابھی مز + اظہار کا منتظر بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمنؔ قی اردؒ پ کستان، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۰

۲۔ اشفاق رشید، شدت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲

۳۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، جہانگیر بکس، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۷۱

۴۔ سلمان صدیق، ماہ مایا، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۰

۵۔ محمد سعید شیخ، زمین کا دکھ، سنگ میل Å X، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۶۰

۶۔ شاہد صدیقی، آدھے سے ادھورے خواب، ص ۱۱۰

۷۔ محمد سعید شیخ، زمین کا دکھ، ص ۶۱

۸۔ امجد طفیل، پ کستانی اردؒ ول بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں، مشمولہ: کتابی سلسلہ: اسالیب سالنامہ، جلد اول، جولائی ۲۰۱۱ء ؔ دسمبر ۲۰۱۲ء، مرتبہ: عنبرین حسیب عنبر، اسالیب Å X، کراچی، ص ۶۱۴

۹۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵

۱۰۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۶، ۱۰۷

۱۱۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۴۹۲، ۴۹۳

۱۲۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، ص ۲۱۳، ۲۱۴

۱۳۔ محمد عاصم $، دائرہ، سانجھ Å X، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۳

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، دا ٔ ہ ا ۔ ہ اسرارؒ ول، مشمولہ: ماہنامہ قومی زؒ ن، شمارہ دسمبر ۲۰۱۰ء، انجمنؔ قی اردو، کراچی، مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۳۲

۱۵۔ محمد عاصم $، دا ٔ ہ، ص ۱۷۰

۱۶۔ امجد طفیل، پ کستانی اردؒ ول بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں، مشمولہ: کتابی سلسلہ: اسالیب سالنامہ، ص ۶۲۵، ۶۲۶

۱۷۔ محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، اکادمیؒ ؒ یفت، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۰۷

۱۸۔ محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، ص ۷۳

۱۹۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سرکار، ص ۱۴۴

۲۰۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ، سانجھ Å X، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۶

۲۱۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ، ص ۶۶

۲۲۔ امجد طفیل، ڈاکٹر، غلامؒ غ کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ: کتابی سلسلہ ا۔ ا، شمارہ ۱۰، ۲۰۱۳ء، مدیر: احسن سلیم، Beyond Time Publications، کراچی، ص ۵۳۳

۲۳۔ اقبال خورشید، غلامؒ غ خود کو دریافت کرنے کا وسیلہ بنا، (مصاحبہ: مرزا اطہر بیگ، مشمولہ: کتابی سلسلہ ا۔ ا، شمارہ ۱۳، جنوریؔ مارچ ۲۰۱۲ء، مدیر: احسن سلیم، Beyond time Publication، کراچی، ص ۵۳

۲۴۔ امجد طفیل، ڈاکٹر، غلامؒ غ کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ: کتابی سلسلہ ا۔ ا، شمارہ ۱۰، ۲۰۱۳ء، مدیر: احسن سلیم، Beyond Time Publications، کراچی، ص ۵۲۷

۲۵۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ، ص ۹۶

۲۶۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، ص ۱۸۵

۲۷۔ اقبال خورشید، غلامؒ غ خود کو دریافت کرنے کا وسیلہ بنا، (مصاحبہ: مرزا اطہر بیگ، مشمولہ: کتابی سلسلہ ا۔ ا، شمارہ ۱۳، جنوریؔ مارچ ۲۰۱۲ء، مدیر: احسن سلیم، Beyond time Publication، کراچی، ص ۵۵، ۵۶